بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرم مراد

پاکستان کو بنے ابھی مشکل سے دو ماہ ہوئے تھے' کہ پہلے گورنر جنرل کے خصوصی ایلچی' میر لائق علی ۲ ارب ڈالر کے قرض کے لیے کاسۂ گدائی لے کر واشنگٹن پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں جو "حکومت پاکستان کا میمورنڈم بنام اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ" تھا' وہ پڑھنے کے لائق چیز ہے۔ اور اگر دو آنسو اب بھی آنکھوں میں باقی رہ گئے ہوں' تو وہ بہانے کا مستحق بھی۔

پاکستان نے امریکا کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلایا ؟ میمورنڈم میں کہا گیا تھا کہ :

> سب سے پہلے دفاع کے لیے' اور پھر معاشی ترقی کے لیے--- کہ ان ہی دونوں پر اس کی بقا کا انحصار ہے--- پاکستان اگر کسی کی طرف دیکھ سکتا ہے تو پہلے امریکا' اور پھر برطانیہ کی طرف۔ (اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا اندرونی خط نمبر ۲۷۴۷ - ۱۰ / ۵۱ F ۸۴۵' مورخہ ۸ اکتوبر ۱۹۴۷' بحوالہ دستاویزات اے' ص ۵)

امریکا اتنی خطیر رقم کیوں دے ؟ میمورنڈم میں پہلے پاکستان کے استریتیجک محلِ وقوع اور روس سے اس کے پڑوس کا ذکر کیا گیا' پھر روس کا خطرہ یاد دلایا گیا' پھر پاکستان کے بغیر برصغیر کا دفاع ناممکن ہونے کا حوالہ دے کر' امریکا کو یقین دہانی کرائی گئی کہ ایک دفعہ پاکستان دفاعی اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط ہو جائے پھر "اگر کوئی وقت پڑا' تو (آپ دیکھ لیں گے) پاکستان کے باشندے آپ کا کیسا بھرپور ساتھ دیں گے"۔ (ایضاً' ص ۶)

آخر میں دستِ سوال یوں دراز کیا گیا: "اس مقصد کے لیے بس ضرورت ہے تو صرف مالیات کی' بلکہ دراصل مالیات کے مستقل سرچشمہ کی" (ایضاً' ص ۷)۔ شرم کی بات یہ ہے کہ فوجیوں کی تنخواہیں تک مانگنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کیا گیا۔ (فارن ریلیشنز ۲ے' بحوالہ ایضاً' ص ۷)

یوں پاکستان کے حکمرانوں نے اس کے پیدا ہوتے ہی بلا جھجک اس کا مقدر مغرب اور امریکا کے

ساتھ باندھ دیا۔ گویا اپنی آزادی و سلامتی کے تحفظ اور معاشی ترقی کی موہوم توقعات کے عوض میں' جو بالآخر ایک سراب ثابت ہوئیں' پاکستان نے اپنی اسٹریٹیجک آزادی سے دست بردار ہونے اور ایشیا میں روس کے خلاف امریکا کا مہرہ بننے کی پیش کش کر دی۔ اس آزادی سے دست بردار ہونے کی' جو مسلمانانِ برِّصغیر نے خاک و خون کے سمندر سے گزر کر انگریز اور ہندو سے حاصل کی تھی۔

پاکستان کے گورنر جنرل کی اس درخواست کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے افسران نے بلا توقف مسترد کر دیا' اور میر لائق علی خالی ہاتھ واپس لوٹ آئے (دستاویزات' ص ۷)۔ لیکن یہ میمورنڈم ایک سوچ اور فکر کا حامل تھا' اور اس کے ذریعہ پاکستان کے مستقبل کی مستقل حکمتِ عملی کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ چنانچہ وزیر اعظم لیاقت علی خاں' گورنر جنرل غلام محمد اور سب سے بڑھ کر کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خاں مایوس نہ ہوئے' اور انھوں نے واشنگٹن کا دامن جو ایک دفعہ پکڑ لیا تھا' چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ مکمل اخلاص اور حنیفیت کے ساتھ امریکا کے پیچھے پڑے رہے کہ وہ اسلحہ اور دیگر دفاعی اور اقتصادی امداد کے عوض میں روس کے گرد حصار باندھنے کے لیے پاکستان کی خدمات قبول کر لے' اور اسے کسی نہ کسی دفاعی معاہدہ کے "عقد" میں لے لے۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ کمزور ہو یا طاقت ور' دنیا کی ہر قوم حلیفوں کی محتاج ہوتی ہے۔ اور پاکستان تو انگریز اور ہندو کے ہاتھوں بنا ہی ایسی کس مپرسی کے عالم میں تھا کہ اسے شاید کسی بڑے ملک کی مدد حاصل کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ خزانہ خالی تھا' مرکزی ملازمین کے لیے فرنیچر تک مفقود تھا' اسلحہ اور اسلحہ ساز فیکٹریاں سب بھارت کے پاس رہ گئے تھے' ملک میں کوئی صنعتی ڈھانچا نہ تھا۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہو گا کہ پاکستان جیسے نوزائیدہ اور کمزور ملک اور امریکا جیسی عالمی طاقت کے درمیان برابر کے لین دین کی بنیاد پر کوئی معاہدہ دشوار تھا۔

ہمیں اپنے ابتدائی لیڈروں کی نیت اور اخلاص کے بارہ میں کوئی شک نہیں۔ لیکن یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جس خود فریبی' ناعاقبت اندیشی' ملک و ملت کے مفادات سے لاپروائی' اور بے مثال والہانہ اور فدویانہ خود سپردگی کے ساتھ پاکستان کو امریکا کے ساتھ فوجی معاہدوں میں باندھنے اور اقتصادی امداد کی بھیک حاصل کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کی گئی' اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ پاکستان ایسا تہی دامن بھی نہ تھا کہ موہوم فائدوں کی خاطر اتنی خطیر قیمت ادا کرتا' امریکا کے بھی اپنے اسٹریٹیجک مفادات کے تقاضے تھے جنھیں وہ نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔

بہرحال بالآخر پاکستانی لیڈروں کی کوششیں رنگ لائیں۔ ان کی کاوشوں کی وجہ سے نہیں' امریکا کی اپنی اسٹریٹیجک مجبوریوں کی وجہ سے۔ روس سے "سرد جنگ" شروع ہو چکی تھی' اور امریکا بھی

اب حلیفوں کا محتاج تھا۔ پھر بھی اگر اسے اپنا مطلوب حلیف بھارت ہاتھ آجاتا' تو وہ غالباً پاکستان سے ہرگز کوئی دفاعی معاہدہ نہ کرتا۔

ایسا ہو جاتا تو کیا زیادہ اچھا نہ ہوتا؟ اس کا جواب اب تاریخ نہیں دے سکتی۔ خیال آتا ہے کہ پھر شاید ہمیں اتنی آزادی نصیب رہتی کہ ہمارا پہلا وزیر اعظم روس کا دورہ کر سکتا' چین کی کمیونسٹ حکومت کو ہم بروقت تسلیم کر سکتے' پچاس کے عشرہ ہی میں مسلمان ممالک کو ناراض کرنے کے بجائے ان سے مستحکم تعلقات استوار کر لیتے' سویز کے مسئلہ پر برطانیہ کی حمایت کرنے پر مجبور نہ ہوتے' ۱۹۶۲ میں کشمیریوں کو حقِ خود ارادیت دلانے کے لیے نتیجہ خیز اقدام کر سکتے۔ پھر شاید ہم اتنے بے دست وپا بھی نہ ہوتے کہ فرانس سے ایٹمی پلانٹ نہ خرید سکیں' کہوٹہ میں اپنا ایٹمی پروگرام منجمد کرنے پر مجبور ہو جائیں' کشمیری مجاہدین بھائیوں کی امداد سے دست کش ہونا پڑے' نقد قیمت ادا کر دینے کے باوجود ہمارے ایف ۱۶ طیارے امریکا میں کھڑے رہیں اور ہم کچھ نہ کر سکیں' حتیٰ کہ ہم اپنے قانون کے تحت توہینِ رسالت کے ملزموں پر مقدمہ بھی نہ چلا سکیں۔ پھر شاید ہم دو ٹکڑے نہ ہوتے' سیاسی عدم استحکام کا شکار بھی نہ ہوتے' معاشی طور پر خود کفیل بھی ہو سکتے' کم سے کم اپنا بجٹ بنانے کا اختیار ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے بجائے ہمارے ہی پاس رہتا۔ اور شاید--- پھر ہم اپنے دین اور ثقافت کی راہ پر بھی گامزن ہو سکتے۔ لیکن تاریخ کے دھارے میں بہتے ہوئے' ماضی کے بارہ میں سنہرے خواب دیکھنے کا کیا حاصل!

اکتوبر ۱۹۴۷ میں میر لائق علی تو خالی ہاتھ واپس آئے' لیکن جلد امریکا کی سوچ اور رویے تبدیل ہونا شروع ہو گئے۔ ۹ فروری ۱۹۵۰ کو اس نے پاکستان کے ساتھ پوائنٹ فور (Point Four) پروگرام کے تحت ٹیکنیکل تعاون کا معاہدہ' اور پھر ۱۵ دسمبر ۱۹۵۰ کو باہمی امداد کا غیر رسمی معاہدہ کر لیا۔ پھر اکتوبر اور نومبر ۱۹۵۳ میں جنرل ایوب کی واشنگٹن یاترا کے بعد ۱۹ مئی ۱۹۵۴ کو' پاکستان کی فوجی امداد کی درخواست قبول کر کے' امریکا نے "امریکا - پاکستان باہمی دفاعی معاہدہ" پر دستخط کر دیے۔ ایک سال بعد ستمبر ۱۹۵۴ میں' فوجی امداد کی "قیمت" کے طور پر پاکستان نے امریکا کی خواہش پر منیلا پیکٹ پر دستخط کر کے اس کی بنائی ہوئی جنوب مشرقی ایشیا کے لیے دفاعی تنظیم ' سیٹو (Seato) میں شرکت اختیار کر لی۔ اور پھر مزید فوجی امداد کے وعدہ پر ایک سال بعد' اکتوبر ۱۹۵۵ میں وہ مشرقِ وسطیٰ کے لیے امریکی دفاعی تنظیم "بغداد پیکٹ" میں بھی شریک ہو گیا (اگرچہ اس میں امریکا خود باقاعدہ شریک نہ ہوا' اسرائیل کی خاطر)۔ یہ وہ وقت تھا جب پاکستان کو "روس کے خلاف شمالی محاصرہ کا مشرقی بازو' ایشیا میں امریکی دفاعی

نظام کا محور' اور امریکا کے "یاروں میں سب سے گہرا یار (most allied ally)" قرار دے کر سراہا جا رہا تھا" (ورسنگ ۳-ب' ص ۶)۔ مسٹر بھٹو نے' ۲۷ نومبر ۱۹۶۲ کو' نیشنل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے بجا طور پر اس لمحہ کو ایسا لمحہ قرار دیا "جب ہماری تاریخ ایک فیصلہ کن موڑ مڑ گئی تھی"۔ (دستاویزات' ج ا' ص ۲۱۶)

لیکن مختصر سے ہنی مون (۱۹۵۴ - ۱۹۶۲) کے بعد' جب ۱۹۶۲ میں صدر کینیڈی نے آناً فاناً پاکستان کے اصل دشمن بھارت کو ۶ ڈویژن فوج کے لیے ساز و سامان اور ۱۵ سکواڈرن جہاز فراہم کر دیے' ان بظاہر گہرے تعلقات پر تاریکی کے سائے پڑنا شروع ہو گئے۔ پھر تاریکی کے یہ سائے گہرے ہی ہوتے چلے گئے۔ اگرچہ بیچ میں افغان جہاد کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لیے دیا ٹمٹمایا اور ان تعلقات نے سنبھالا لیا' لیکن بگاڑ بڑھتا ہی گیا۔ اسلحہ کی فراہمی پر بار بار پابندی لگائی گئی' اور اب عرصہ سے مکمل بند ہے' بلکہ اب تو ہر طرح کی امداد بند ہے۔ امداد قرضوں میں بدلی' قرضے نقد فروخت میں' اور نقد فروخت' قیمت لینے کے بعد بھی مال دینے سے انکار میں۔ پاکستان کا دفاع تو کجا' اسے دو ٹکڑے کرنے کی بھارتی کارروائی کو امریکا کی حمایت حاصل رہی۔ ایٹم بم تو دور کی بات ہے' فرانس سے ایٹمی پلانٹ کے حصول پر پاکستان کو عبرت ناک مثال بنانے کی کارروائی شروع کی گئی۔ کشمیر پر کوئی موثر حمایت تو کیا ملتی' الٹا پاکستان کے سر پر "دہشت گرد" قرار دیے جانے کی تلوار لٹکا دی گئی۔

تعلقات میں بگاڑ کے طویل دور کے بعد' آج کل پھر اسلام آباد اور واشنگٹن کے درمیان آمدورفت اور بات چیت زور شور سے جاری ہے۔ جناب نواز شریف نے اپنے خصوصی ایلچی کے طور پر چودھری نثار علی کو مطلوبہ یقین دہانیاں کرانے واشنگٹن بھیجا' تو صدر پاکستان جناب فاروق لغاری نے "نجی دورہ" میں بھی بہ نفسِ نفیس امریکی نائب صدر کے پاس حاضر ہو کر ان سے مذاکرات کیے۔ انھوں نے امریکا کا دل موہنے کے لیے عابدہ حسین کو سفیر بنا کر بھیجا' تو انھوں نے ڈاکٹر مدیحہ لودھی کو منتخب کیا۔ واشنگٹن میں پاکستانی افسران خاموش ڈپلومیسی کا راؤنڈ چلا رہے ہیں' تو رابرٹ اوکلے' جو ایک زمانہ میں پاکستان میں امریکن وائسرائے کہلاتے تھے' ایک بھاری بھرکم وفد لیے اسلام آباد میں مصروفِ گردش ہیں۔

یہ سب کچھ حسبِ سابق تاریکی کے دبیز پردوں کے پیچھے ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک میں اہم قومی معاملات میں قوم کو باخبر رکھنے کی روایت کبھی بھی نہیں رہی۔ عوام کالانعام اس قابل کہاں! چنانچہ آج بھی قوم کو کچھ پتا نہیں کہ ان تاریک پردوں کے پیچھے زندگی اور موت کے کیا فیصلے ہو رہے ہیں' یہ

تاریکیاں' مغالطہ آمیزیوں' غلط بیانیوں اور طفل تسلیوں سے اور گہری ہی ہوتی جا رہی ہیں' لیکن ماضی کا آئینہ ہمارے پاس ہے۔ اس آئینہ ہی میں مستقبل کی جھلک نظر آ سکتی ہے۔ اس آئینہ پر نظر ڈالنا ہی آج ہمارے پیشِ نظر ہے۔

مذاکرات پہلے بھی ہوئے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے' معاہدات بھی ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے' لیکن اس بیل کا اس طرح منڈھے چڑھنا کہ پاکستان کے اہداف کسی درجہ میں بھی حاصل ہوں' ممکن نظر نہیں آتا۔ کیونکہ پاکستان اور امریکا کے اہداف و مقاصد کے درمیان روزِ اوّل ہی سے بنیادی تضاد اور تفاوت رہا ہے۔ امریکا ایک بہت طاقت ور ملک ہے' اور طاقت ور اپنے مفادات حاصل کرنے میں زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ امریکا نے اس معاملہ میں کبھی پاکستان کو دھوکے میں نہیں رکھا کہ وہ یہ معاہدات کیوں کر رہا ہے' مگر پاکستانی حکمرانوں نے ہمیشہ خود فریبی کو ترجیح دی' قوم کو ناواقف اور غلط فہمیوں میں مبتلا رکھا' اور حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریز کیا۔

ہمیں یقین ہے کہ آج صورتِ حال اس وقت سے بدتر ہے۔ کل کے حکمرانوں کے مقابلہ میں' وہ جیسے کچھ بھی تھے' آج کے حکمراں بونے ہیں اور مسائل دیو قامت ہو گئے ہیں۔ روس کے زوال سے پاکستان نے جس ایک کارڈ سے اپنا کھیل کھیلا تھا' وہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ گویا پاک امریکا تعلقات کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی ہے۔ حکمراں خود تو شاید کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں' لیکن انھیں قوم کو خوش فہمیوں میں مبتلا رکھنے سے یقیناً کوئی دریغ نہیں ۔ اس سے بڑی ستم ظریفی کیا ہو سکتی ہے کہ ایٹمی صلاحیت اور کشمیر جیسے اہم قومی معاملات پر اپنی پالیسی کے بارہ میں امریکا تو کچھ نہیں بول رہا' مگر ہمارے اعلیٰ ترین عہدیدار زور شور سے اس کی ترجمانی اور وکالت میں مشغول ہیں۔

امریکا کی سوچ اور رویوں میں تبدیلی کیوں رونما ہوئی ؟

کہاں تو ۱۹۴۷ء' کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی درخواست اس لائق بھی نہ سمجھی گئی کہ اوپر بھیجی جائے' اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے نیچے کے چار افسران نے اسے ازخود ہی مسترد کر دیا (دستاویزات' ص ۶)' اور کہاں ۱۹۵۵ء' کہ پاکستان کو امریکا نے اپنا یار غار بنا لیا۔ اس کے کیا مفادات تھے کہ وہ پاکستان کو اسلحہ دینے پر تیار ہو گیا' اور اسے اپنے ساتھ دفاعی معاہدوں میں باندھ لیا ؟

یہ تبدیلی تیزی سے بدلتی ہوئی عالمی سیاست اور روس اور کمیونزم کے خطرہ کی وجہ سے رونما ہوئی۔ دوسری جنگِ عظیم میں امریکا اور روس کے درمیان جو مجبوری کے حلیفانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے' وہ جلد ہی ٹوٹنا پھوٹنا شروع ہو گئے' اور دونوں کے درمیان سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ جولائی ۱۹۴۷ء

کے فارن افیرز' میں جارج ایف کینان نے مشہور زمانہ مضمون ''سوویت طرزِ عمل کے سرچشمے'' میں روسی خطرہ کی نشان دہی کرتے ہوئے' اس کے مقابلہ کے لیے اس کو ''محدود رکھنے'' کی حکمتِ عملی پیش کی۔ (یہ بات دلچسپ ہے کہ فارن افیرز' ہی میں ''اسلامی خطرہ'' کے خلاف ہنٹنگٹن کے حالیہ مضمون ''تہذیبوں کا تصادم'' اسی مضمون کا ہم پلہ قرار دیا جا رہا ہے)۔ امریکی تعبیرِ تاریخ کے مطابق' ایران' یونان' اور ترکی میں روسی مداخلت' فروری ۱۹۴۸ میں چیکو سلاواکیہ میں کمیونسٹ انقلاب' ۴۹-۱۹۴۸ میں برلن کی ناکہ بندی' یکم اکتوبر کو چین میں کمیونسٹ حکومت کے قیام' اور پھر ۲۵ جون ۱۹۵۰ کو کورین جنگ کے آغاز نے سرد جنگ کو عروج پر پہنچا دیا۔ چنانچہ امریکا نے سرگرمی کے ساتھ روس کو محدود رکھنے کی حکمتِ عملی کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ اس حکمتِ عملی کے لیے اسے :

۱۔ ایسے اڈے درکار تھے' جہاں سے روس اور چین پر نگاہ رکھی جا سکے' اور وقت آنے پر ان کے خلاف جنگی کارروائیاں بھی کی جا سکیں۔

۲۔ امریکا سے باہر ایسے میدانِ جنگ درکار تھے' جہاں ان کے خلاف جنگ لڑی جا سکے۔ (یاد رہے کہ آج تک کوئی ''امریکن جنگ'' امریکا کی سرزمین پر نہیں لڑی گئی ہے)۔

۳۔ ایسی فوجیں درکار تھیں' جو اپنے اپنے مقام پر امریکا کی جنگ لڑ سکیں' اور امریکا کو' کوریا کی طرح اپنی فوجیں موت کے منہ میں نہ بھیجنا پڑیں۔

۴۔ ایسے حلیف ممالک درکار تھے جو روس اور چین کے گرد حصار بنا لیں اور درج بالا ضروریات پوری کریں' تاکہ روس محدود ہو کر رہ جائے اور مزید پیش قدمی نہ کر سکے۔

پاکستان امریکا کی یہ ساری اسٹریٹیجک ضرویات بدرجۂ اتم پوری کرتا تھا۔ روس اور چین کی سرحد پر اس کا محلِ وقوع انتہائی موزوں تھا' اڈوں کے لیے بھی' میدانِ جنگ کے لیے بھی۔ اس کے فوجی اچھی نسل کے لڑنے والے شمار ہوتے تھے' اس کے حکمراں مغرب کے کاسہ لیس تھے۔ چنانچہ پہلے گورنر جنرل کی درخواست مسترد کر دینے کے چند ماہ بعد ہی امریکا کے اعلیٰ ترین حلقوں کی نگاہیں پاکستان پر پڑنا شروع ہو گئیں۔

بیچ میں مشکل حائل تھی صرف پاکستان کے اصل حریف بھارت کی۔ وہ ہر لحاظ سے امریکا کے لیے زیادہ پرکشش اور سود مند متبادل تھا۔ امریکا اسے' اس کی (امریکی وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس کے الفاظ میں) ''غیر اخلاقی (immoral)'' غیر جانبداری کے باوجود' نہ صرف بے انتہا چاہتا تھا' بلکہ کسی قیمت پر ناراض کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ تو پاکستان کی ''قسمت'' تھی کہ وہ امریکا کی ساری ضروریات سے لیس' صحیح محل وقوع پر' صحیح وقت پر' دوستی کا ہاتھ پھیلائے ہوئے کھڑا تھا۔ امریکا کو اس کا اصل محبوب

(بھارت) ہاتھ نہ آرہا تھا' اس کے اسٹریٹیجک مفادات کا دباؤ برابر بڑھ رہا تھا' چنانچہ وہ پاکستان کا ہاتھ تھامنے پر مجبور ہو گیا۔

امریکا کو پاکستان کے کسی اسٹریٹیجک مفاد سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خصوصاً بھارت کے معاملہ میں اس کا مفاد پاکستان کے مفاد سے متصادم تھا۔ چنانچہ وہ صرف پاکستان کے فوجی اڈوں' جنگی میدانوں' فوجی جوانوں' منڈیوں اور مغرب سے اس کی وابستگی کے بارہ میں سوچ رہا تھا۔

سب سے پہلے ۲ اگست ۱۹۴۸ کو جوائنٹ چیفس آف اسٹاف (J C S) نے اپنے ایک میمورنڈم میں "کراچی سے مشترکہ فوجی کارروائیاں کرنے کے حقوق حاصل کرنے" کی ضرورت پر زور دیا (فارن ریلیشنز' ۱۹۴۸' بحوالہ دستاویزات' ص ۱۱)۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۹ کے ایک دوسرے میمورنڈم میں انھوں نے پھر کہا: روس سے متصل جنوبی ایشیا کے ممالک کے ذریعہ' روس کے اندر نظریاتی اور جاسوسی کارروائیوں کے روشن امکانات ہیں۔ ... پاکستان کا کراچی - لاہور علاقہ اسٹریٹیجک اہمیت اختیار کر سکتا ہے۔ یہاں سے وسطِ روس پر ہوائی حملے کیے جا سکتے ہیں' اور مشرقِ وسطیٰ کے تیل کے علاقوں کے دفاع یا ان کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے فوجیں روانہ کی جا سکتی ہیں۔ (فارن ریلیشنز' ۱۹۴۹' بحوالہ دستاویزات' ص ۱۵)

بالآخر صدر ٹرومین نے دسمبر ۱۹۵۱ میں پاکستان کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ: "بحرِہند پر اپنے محلِ وقوع اور وسطِ ایشیا کے زمینی راستوں پر کنٹرول کی وجہ سے جنوبی ایشیا میں پاکستان ہمارا ایک قیمتی حلیف ہے"۔ (دستاویزات' ص ۴۷)

امریکا صرف اڈے ہی نہیں چاہتا تھا' بلکہ اس سے زیادہ اسے فوجیں مطلوب تھیں جو اس کی جنگ لڑ سکیں۔ اور منڈیاں بھی۔ نیشنل سکیورٹی کونسل کی ایک اسٹاف اسٹڈی میں' جسے ۲۵ جنوری ۱۹۵۱ کو صدر ٹرومین نے منظور کیا' امریکن اہداف متعین کرتے ہوئے کہا گیا: "ایک طرف امریکا اور اس کے دوست ممالک کو اس علاقہ کے وسائل اور منڈیاں دستیاب ہونا چاہئیں' دوسری طرف ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ ... یہ اپنے وسائل روسی بلاک کو فراہم کرنے سے انکار کر دیں ... پاکستان میں کراچی' راولپنڈی اور لاہور جیسے مقامات پر ہوائی اڈے' ایشیا یا شرقِ قریب میں کسی بھی ملک کے اڈوں کے مقابلے میں' روس کے بیش تر علاقوں سے (بشمول صنعتی علاقوں کے) زیادہ قریب ہوں گے" (دستاویزات' ص ۴۵)۔ امریکا اور برطانیہ کے اعلیٰ عہدیداران بھی آپس میں انھی خطوط پر خفیہ منصوبہ بندی کر رہے تھے (دستاویزات' ص ۴۷' ۵۰)۔ اس سے پہلے سیلون میں' ۲ مارچ ۱۹۵۱ کو امریکا کے سفارتی افسران متفقہ طور پر یہ سفارش کر چکے تھے کہ: "امریکا جلد از جلد پاکستان سے سمجھوتہ کر

کے پاکستانی فوجوں کو مسلح اور مضبوط بنائے' تاکہ [کسی] جنگ کے آغاز ہی میں مغربی بازو پر پاکستانی فوجوں کا دستیاب ہونا یقینی ہو۔ (دستاویزات' ص ۴۴)

پاکستان کے بارہ میں امریکا کے اندازے اور بدلتی ہوئی سوچ' اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے بالکل آغاز ہی کے ۳ اپریل ۱۹۵۰ اور یکم جولائی ۱۹۵۱ کے پالیسی بیانات میں صاف دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۔ "پاکستان سے تعلقات میں ہمارا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کی حکومت اور لوگوں کا رخ امریکا اور دیگر مغربی جمہوریتوں کی طرف رہے"۔ (فارن ریلیشنز' ۱۹۴۹' بحوالہ دستاویزات' ص ۲۷)

۲۔ "پاکستان سیاسی طور پر آزاد ضرور ہے' لیکن وہ دفاع اور معاشی ترقی کے لیے بیرونی امداد کا محتاج ہے"۔ (ایضاً)

۳۔ "پاکستان میں ہمارا اطلاعاتی پروگرام... مغرب دوست رائے عامہ پروان چڑھانے کے لیے وضع کیا گیا ہے"۔ (ایضاً)

۴۔ "ہمارا ایک اہم ہدف یہ ہے کہ: "پاکستان میں ایسا رویہ پروان چڑھائیں کہ وہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کو وہ تمام سہولتیں' وسائل و ذرائع اور منڈیاں فراہم کرے جو انھیں حالتِ امن میں مطلوب ہوں یا حالتِ جنگ میں درکار"۔ (فارن ریلیشنز' ۱۹۵۱' بحوالہ دستاویزات' ص ۵۵)

۵۔ "پاکستان کے پاس وہ فوجی افرادی قوت ہے جو روسی جارحیت کا راستہ روکنے میں شرقِ قریب کے ممالک کی مدد کر سکتی ہے'... پاکستان ایران کی مدد کے لیے بھی فوجیں بھیج سکتا ہے"۔ (ایضاً' ص ۵۷)

امریکا نے اپنے اہداف کے حصول میں پاکستان کی اہمیت تسلیم کی' تو فوجی اور اقتصادی امداد دینے کے بارہ میں بھی سوچنا شروع کر دیا۔ پہلے گورنر جنرل کی درخواست کے مسترد کرنے کے تقریباً دو ہی سال بعد' ۱۶ اگست ۱۹۴۹ کو اسسٹنٹ سیکرٹری آف اسٹیٹ میگھی (Mcghee) نے بیرونی فوجی امداد کے کوآرڈی نیٹر کو لکھا: "پالیسی کے بارہ میں ہمارے تمام مطالعات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جنوبی ایشیا کے ممالک میں اپنے قومی سیاسی اہداف کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان کی فوجی امداد کی درخواستوں پر ہمدردی کے ساتھ غور کریں"۔ (دستاویزات' ص ۲۲)

آئزن ہاور کے صدر بن جانے کے بعد' وزیر خارجہ ڈلس روس کے گرد حصار باندھنے کے لیے سرگرم ہو گئے۔ شمالی حصار (Northern Tier) پاکستان کے بغیر ممکن نہ ہوتا تھا۔ ڈلس نے ترکی اور پاکستان کے دورہ سے واپس آنے کے بعد سینیٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا: "ترکی... ہمارا ایک مضبوط مورچہ ہے۔ وہاں لوگ لڑنے کے لیے بالکل تیار ہیں' قوی ہیں' بہادر ہیں اور روح و جذبہ

میں ہمارے حلیف ہیں ... دوسرے سرے پر پاکستان ہے جو بہت مضبوط مورچہ بن سکتا ہے ... ہمیں اسی شمالی حصار پر اعتماد کرنا چاہیے ... [یہاں ترکی' وہاں پاکستان] مشکل ہے کہ کوئی بھی ان کے درمیان پہاڑی دروں سے اندر گھس سکے ... مگر پاکستان کے معاملہ میں مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس اب تک اس کو فوجی امداد دینے کا کوئی پروگرام نہیں' ہم یہ مدد دینے کی ہمت اس لیے نہیں کر پا رہے کہ ہمیں بھارت کے ردِّعمل کا ڈر ہے"۔(دستاویزات' ص ۷۸)

بالآخر امریکا نے اپنے اہداف کی خاطر ۱۹۵۴ کے باہمی دفاعی معاہدہ پر دستخط کر دیے۔ پاکستان کے لیے مطلوبہ فوجی اور اقتصادی امداد ملنے کا دروازہ کھل گیا' اور امریکا کو روس کے خلاف معاہدوں میں پاکستان بطور مہرہ حاصل ہو گیا۔

شروع ہی سے امریکا کا ایک ہدف اور تھا' جو اب زیادہ واضح ہو کر سامنے آ رہا ہے۔ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے جولائی ۱۹۵۱ کے پالیسی بیان میں کہا گیا تھا کہ :

> پاکستان میں ہمارے اہداف کے لیے ایک خطرہ اور ہے' جو کمیونزم کی طرح عیاں نہیں۔ یہ **جاگیرداروں کے رجعت پسند گروہوں اور غیر تعلیم یافتہ مذہبی راہنماؤں (ملاؤں) کی طرف** سے ہے' جو موجودہ مغرب پسند حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں' اور اسلام کے دقیانوسی اصولوں کی طرف واپس لوٹنا چاہتے ہیں۔ ان کی قوت کا سرچشمہ عوام کے مذہبی جذبات اور جاہل لوگوں کی طرف سے تغیر و تبدل کی مخالفت ہے۔ اگر یہ غالب آ گئے تو پاکستان ایک مذہبی ریاست بن جائے گا' جو واضح طور پر مغرب دشمن ہو گی۔ اس لیے ہمیں جمہوری [لادینی] دستور اور جدید تعلیم کے لیے موجودہ حکومت کی کوششوں کی مکمل حمایت کرنا چاہیے۔(دستاویزات' ص ۶۴)

پاکستان وجود میں آتے ہی کیوں پاکستانی حکمرانوں نے اپنا مقدر امریکا کے ساتھ نتھی کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیے ؟

ان کے اہداف اسٹریٹیجک بھی تھے اور تہذیبی بھی۔ تہذیبی طور پر' یہ حکمراں انگریزی تعلیم یافتہ تھے' انگریز کے یارِ وفادار رہے تھے' مغربی تہذیب میں رنگے ہوئے تھے' مغرب سے سخت مرعوب تھے' مغرب کے نقشِ قدم پر چلنے ہی کو فلاح و ترقی کی راہ سمجھتے تھے۔ پاکستان کے لیے ان کی نظروں میں ماڈل اتاترک تھا۔ اس کے لیے مغرب سے جڑنا ضروری تھا۔

مغرب کی معاشی ترقی و سربلندی سے بھی ان کی نگاہیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔ وہ اندھا دھند اس کے

پیچھے بھاگنا چاہتے تھے۔ اس وقت ساری نو آزاد دنیا کی ریت بھی یہی تھی۔ یہ مقصد حاصل ہونا مغرب کے سرمایہ' مغرب کے ماہرین' مغرب کی ٹیکنالوجی اور مغرب کی ثقافت امپورٹ کیے بغیر ممکن نہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے امریکا کو لکھا تھا کہ معاشی ترقی پر ہماری بقا کا انحصار ہے' اور اس کے لیے ہمیں آپ ہی کی طرف دیکھنا ہوگا۔ (دستاویزات' ص ۵)

انگریز سے یاری' اس کی مکمل وفاداری' اس کی فوجوں کے لیے جوانوں کی فراہمی اور اس کے دربار میں کرسی ہی سے انھوں نے اپنی قسمت کو چمکتے دیکھا تھا۔ چنانچہ ان کے دیرینہ تجربہ اور نفسیات نے انھیں یہی سمجھایا کہ' اب جب کہ پاکستان کی صورت میں ایک بہت بڑی جاگیر ان کے ہاتھ آگئی ہے' اس کی قسمت چمکانے کا نسخہ بھی یہی ہے۔ اسی میں اس کی سلامتی' اور دفاع' اس کے قومی اہداف کے حصول' اور اس کی ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔ چنانچہ وہ بلا جھجک امریکا کی سرپرستی حاصل کرنے اور اس کا یارِ وفادار بننے کے لیے کوشاں ہو گئے۔

وہ جاگیردار تھے' دولت مند اور خوش حال تھے' اس لیے فطری طور پر وہ کمیونزم سے' بلکہ قائم و دائم نظام (Status quo) میں کسی بھی تبدیلی کے اندیشہ سے' یا کسی بھی غیر مغربی (non western) تہذیب کے غلبہ سے سخت خائف تھے۔ (ملحوظ رہے کہ روس ہمیشہ غیر مغربی' بلکہ مخالف مغرب صف میں شمار ہوتا رہا ہے' اور اسلام تو ہے ہی)۔ چنانچہ کمیونزم [اور اسلام ؟] کے خلاف مزاحمت میں وہ پوری طرح مخلص اور سنجیدہ تھے' اور اس معاملہ میں ان کا مفاد امریکا کے اسٹریٹیجک مفاد سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ امریکا نے پاکستان کے ساتھ جو کچھ اور جیسی کچھ بھی دوستی رکھی ہے' یا مدد دی ہے' اس کی بنیاد یہی روس دشمنی رہی ہے۔

لیکن پاکستان کے حکمراں جانتے تھے کہ پاکستان کو اصل خطرہ کمیونزم سے نہیں' بھارت سے ہے۔ بھارت کے خلاف دفاع' اس سے اپنی سالمیت کا تحفظ' اور اس کے ساتھ تنازعات میں حمایت و مدد کا حصول' اس کی اوّلین اسٹریٹیجک ضروریات تھیں۔ تقسیم ہوتے ہی بھارت نے مالیات اور اسلحہ میں پاکستان کا حصہ غصب کر کے' اور فوج کشی کے ذریعہ کشمیر پر ناجائز قبضہ کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ پاکستان کو کمزور رکھنا اور اس کی شہ رگ پر قابض رہنا چاہتا ہے۔ پاکستان آغاز ہی سے اس کے ساتھ شدید عدم توازن کا شکار تھا۔ اس کے سپاہیوں کے پاس تو بندوقیں چلانے کے لیے کارتوس تک نہ تھے۔

یہ پاکستان کی بدقسمتی تھی کہ اس کی اسٹریٹیجک کشش محدود تھی' جب کہ اس کا دشمن بھارت امریکا کے لیے کہیں زیادہ پرکشش تھا' اور اس کے عالمی مفادات کے لیے ضروری بھی۔ اس نے مجبوراً

پاکستان کا ہاتھ تو تھاما' تب بھی وہ کسی قیمت پر بھارت کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا' نہ کسی بھی معاملہ میں کسی بھی طرح اس کے مقابلہ میں پاکستان کی حمایت یا مدد۔ پاکستان کی دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ اسے جتنی ضرورت امریکا کی تھی اتنی امریکا کو اس کی ضرورت نہ تھی' اور امریکا جتنا طاقت ور تھا وہ اتنا ہی کمزور تھا۔ اس لیے برابری کے کسی لین دین یا دباؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

امریکا نے کبھی اس بارہ میں پاکستان کو دھوکہ میں نہیں رکھا کہ جو اسلحہ وہ دے رہا ہے کمیونزم کے خلاف ہے بھارت کے خلاف نہیں' اس کے کسی معاہدہ کا اطلاق بھارت سے پاکستان کی کسی جنگ کی صورت میں نہیں ہو گا' بلکہ وہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ پاکستان کی بھارت سے جنگ ہو' اور بھارت کے ساتھ کسی بھی تنازعہ میں وہ مکمل غیرجانبدار رہے گا (اگرچہ دونوں کے درمیان عدم توازن کی وجہ سے یہ "غیرجانبداری" درحقیقت بھارت کی "جانبداری" ہی رہی ہے)۔

لیاقت علی خاں کے پہلے دورہ امریکا کے دوران' ۸ مئی ۱۹۵۰ کو' نیویارک ٹاؤن ہال میں ان کی تقریر کے جواب میں جارج کینان نے صاف صاف کہہ دیا تھا: "ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دوست ہمارے مقام کی نزاکتوں کو سمجھیں' اور ہم سے وہ چیزیں کرنے کی توقع نہ رکھیں جو ہم نہیں کر سکتے۔ صرف باہمی تعلقات ہی میں نہیں' بلکہ عمومی طور پر ایک عالمی طاقت کے طور پر اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے بھی"۔ (دستاویزات' ص ۳۳)

جب پاکستان نے کسی تحفظ کے بغیر کورین جنگ میں امریکا کے موقف کی مکمل حمایت کی' تو وزیر خارجہ ڈین ایچی سن نے ۱۱ مئی ۱۹۵۱ کو کراچی میں امریکی سفیر کو تار دیا کہ وزارتِ خارجہ جا کر زور دیں کہ پاکستان اپنی فوج کوریا بھیجے' کہ "یہ پاکستان کے اپنے مفاد میں ہے" (دستاویزات' ص ۵۲ - ۵۳)۔ سفیر اب سیانا ہو چکا تھا' وہ سیدھا وزیراعظم کے پاس پہنچ گیا۔ لیاقت علی خاں نے ایک ڈویژن فوج بھیجنے کے لیے آمادگی ظاہر کی' لیکن صاف صاف اس کی قیمت بھی مانگ لی: "یہ فیصلہ کی گھڑی ہے۔ پاکستان کوریا میں ہی نہیں' مشرقِ وسطی میں بھی امریکا کے ساتھ چلنے کو تیار ہے ... بشرطیکہ امریکا پاکستان کا ساتھ دے ... بالخصوص کشمیر میں ... اور پختونستان کے مسئلہ پر"۔ امریکی سفیر نے کشمیر پر ایک بیان کی سفارش بھی کی۔

لیکن ایچی سن نے اس پر اپنے ۲۴ مئی کے تار میں سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا: "کشمیر اور افغانستان پر امریکا کی مکمل اور غیرمشروط حمایت کے بدلے لیاقت کی فوجی دستوں کی پیش کش ہم قبول نہیں کر سکتے ... پاکستان کو قائل کرنے کے لیے امریکا سے زیادہ کوریا میں پاکستانی ڈویژن کو اسلحہ اور خرچ دینے کی پیش کش کر سکتا ہے۔ (گویا خرچ بھی پاکستان کو اٹھانا تھا)۔ لیاقت کی تجویز اس لیے ناقابل

قبول ہے کہ امریکا کی طرف سے اس قسم کے مسائل پر پاکستان کی حمایت کا منطقی نتیجہ یہ ہو گا کہ (الف) بھارت اور افغانستان ہم سے بالکل کٹ جائیں گے' (ب) ایشیا میں آج کے اور کل کے مسائل پر امریکا کی آزادیِ عمل محدود ہو جائے گی ... جب کہ فوجی دستے فراہم کرنا تو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے تحت پاکستان کی ذمہ داری بنتی ہے"۔ (دستاویزات' ص ۵۵)

پتا نہیں کہ ابتدائی حکمرانوں کو بین الاقوامی سیاست کا صحیح ادراک نہیں تھا' وہ خود فریبی کا شکار تھے' یا جان بوجھ کر خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتے تھے۔ یا' کیونکہ قوم سے جھوٹ بولنے اور اس کو فریب دینے کی روایت بھی ہمارے ملک کی بڑی دیرینہ اور مستحکم روایت ہے' شاید وہ اسی میں مشغول ہوں۔ بہرحال یہ مفروضہ کہ امریکا کی ترجیحات کبھی بھی وہ ہو سکتی تھیں جو پاکستان کی ہیں' احمقانہ بھی تھا اور تباہ کن بھی۔ چنانچہ پاکستان نے اپنے استریتیجک مفاد کے لیے جتنا مکمل اعتماد اپنے حلیف پر کیا' وہ کبھی اس اعتماد پر پورا نہ اترا۔

پاکستانی حکمران امریکا سے صرف اسلحہ کے طالب نہ تھے' بلکہ وہ مسلسل بھارت کے خلاف اپنی سلامتی کے لیے اس کی ضمانت کے خواہش مند رہے ہیں۔ خصوصاً جب امریکا کی جنگ لڑنے کے لیے کرایہ کے سپاہی دینے کا سوال اٹھتا تو پاکستان ایسی ہی ضمانت کا مطالبہ کرتا۔ امریکا یہ قیمت دینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوا' بلکہ اس نے کبھی یہ تسلیم ہی نہیں کیا کہ پاکستان کو اصل خطرہ بھارت سے ہے (طاہر خیلی ۴۔' ص ۴ - ۵)۔ شروع میں ایوب خاں کے مطالبہ کے جواب میں' امریکا نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ ۱۹ مئی ۱۹۵۴ کے دفاعی معاہدہ میں "خطرہ" کا تعین مبہم چھوڑ دیا' اور بھارت یا روس کا ذکر کرنے کے بجائے اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے خوش نما الفاظ کا سہارا لیا۔

ایوب خاں نے ۱۹۵۸ میں مارشل لا لگانے کے بعد یہ مسئلہ پھر اٹھایا۔ ۵ مارچ ۱۹۵۹ کے باہمی تعاون کے معاہدہ میں بھی امریکا' پاکستان کی سلامتی کی ضمانت دینے پر آمادہ نہ ہوا' لیکن یہ کہنے پر رضامند ہو گیا کہ: "امریکا' پاکستان کی آزادی اور سالمیت کی بقا کو اپنے قومی مفاد اور عالمی امن کے لیے ضروری سمجھتا ہے" اور "پاکستان کے خلاف جارحیت کی صورت میں ... ایسے مناسب اقدامات کرے گا ... جن پر فریقین باہم متفق ہوں" (دستاویزات' ص ۱۵۶ - ۱۵۷)۔ ان خوشِ نما الفاظ کی قیمت میں امریکا نے ایوب خاں سے پشاور میں جاسوسی کا اڈہ حاصل کر لیا۔ پاکستان میں ان الفاظ کو ضمانت ہی سمجھایا گیا' اور امریکا نے بھی اس کی تردید کرنا خلافِ مصلحت سمجھا۔

لیکن حقیقت جلد کھل کر سامنے آگئی۔ ۱۹۶۲ میں صدر کینیڈی نے طیاروں کے ذریعہ بھارت کو

بھاری تعداد میں اسلحہ بھیجنے میں لمحہ برابر دیر نہ لگائی' اور صدر ایوب سے وعدہ کے باوجود پاکستان سے کوئی مشورہ نہ کیا۔ ۱۹۶۵ میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا' تو مدد تو درکنار امریکا نے پاکستان کو ہر قسم کا اسلحہ دینے پر پابندی لگا دی' اور ۱۹۷۱ میں جب بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر کے پاکستان کو دو ٹکڑے کر دیا' تو امریکا نے انگلی بھی نہ ہلائی۔ صاف بات ہے کہ امریکا کو پاکستان کی سالمیت سے کوئی دلچسپی نہ تھی' اور بنگلہ دیش بننے پر بھی اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ صدر نکسن نے بعد میں لکھا کہ : "ہم یہ تسلیم کرتے تھے کہ کسی سیاسی سمجھوتے کے نتیجہ میں مشرقی پاکستان آزاد ہو گا۔ اور ہم اس مقصد کے لیے کام کرنے کو بھی تیار تھے" (دستاویزات' ج ۲' ص ۲۰۱)۔ کسنجر کی سربراہی میں واشنگٹن اسپیشل ایکشن گروپ کی رودادوں میں یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ "پاکستان کی سلامتی کے لیے امریکا کی کوئی قانونی ذمہ داری نہیں" (دستاویزات' ج ۲' ص ۱۶۶' ۱۸۴)۔ ہاں' جب یہ خدشہ ہوا کہ ہندوستان آزاد کشمیر اور مغربی پاکستان پر بھی قبضہ کر لے گا' تو امریکا نے اسے 'اپنے مفاد میں' روکنے کی کوشش کی۔

۱۹۸۰ میں جنرل ضیا نے' افغانستان پر روسی حملہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے' صدر کارٹر کی انتظامیہ سے بات چیت کے دوران پھر ایک ایسے باقاعدہ معاہدہ پر زور دیا جو پاکستان کی مشرقی سرحد کے تحفظ کی ضمانت دے' اور جس کی توثیق کانگرس بھی کرے' امریکا نے یہ مطالبہ ماننے سے پھر انکار کر دیا۔ صدر کارٹر نے پاکستان کو بہلانے کے لیے صرف کانگریس کے سامنے ۱۹۵۹ کے معاہدہ کو پھر دہرا دیا' جو ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ میں کھوکھلا ثابت ہو چکا تھا۔

جس بے سرو سامانی کے عالم میں پاکستان بنا' اس کی وجہ سے امریکا کے در تک جانے میں اس کا ایک اہم ہدف اسلحہ کا حصول تھا۔ ۱۹۵۵ - ۱۹۶۵ کے دوران امریکا کے فراہم کردہ ۹۰۰ ملین ڈالر کے اسلحہ نے یقیناً پاکستان کی دفاعی صلاحیت میں نمایاں اضافہ کیا۔ لیکن اسلحہ جس مقدار میں ملا' اس کی جتنی گراں سیاسی قیمت "پہلے" یا "بعد" میں وصول کر لی گئی مگر اسلحہ نہیں دیا گیا' اور پھر جس رفتار سے ملا' جس طرح اس پر بار بار بندشیں لگتی رہیں' وہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ اسلحہ پاکستان کے دفاع اور سلامتی کے لیے نہ تھا۔ یہ بات الگ اپنی جگہ قابلِ غور ہے کہ کیا اس اسلحہ کے لیے پاکستان کو وہ گراں اسٹریٹیجک قیمت ادا کرنا چاہیے تھی جو اس نے کی؟

امریکا نے پاکستان کو اسلحہ کی فراہمی پر پہلی پابندی ۱۲ مارچ ۱۹۴۸ کو لگائی۔ کشمیر میں فوجی کارروائیوں کے آغاز کے نتیجہ میں' وزیر خارجہ جارج مارشل کی سفارش پر صدر ٹرومین نے' بغیر

اعلان کے بعد یہ غیر رسمی پابندی عائد کی (دستاویزات' ص ۹۸)۔ غیر جانب داری کے نام پر یہ پابندی انتہائی جانب دارانہ تھی' اس لیے کہ اس وقت پاکستان کے پاس تو کارتوس تک بھی نہ تھے۔ یہ پابندی اتنی شدید تھی کہ جب مئی ۱۹۴۸ میں برطانوی حکومت نے کچھ کارتوس پاکستان کو بیچنا چاہے تو اس کو منع کر دیا گیا۔ یہ پابندی ۲۹ مارچ ۱۹۴۹ کو اٹھائی گئی۔

اسلحہ فراہم کرنے کے تقریباً دس سالہ دور کے بعد' جس دوران پاکستان نے امریکا کے علاوہ کسی سے کوئی اسلحہ نہیں لیا' اور جس کے نتیجہ میں پاکستان کی دفاعی صلاحیت اس "مقام" پر پہنچ گئی تھی کہ وہ ہندوستان کے حملہ کو "۱۷ دن" تک روک سکے' ۸ ستمبر ۱۹۶۵ کو صدر جانسن نے دوسری بار پاکستان کو ہر قسم کے اسلحہ کی ترسیل پر' بلکہ تمام معاشی امداد پر' مکمل پابندی عائد کر دی۔ یہ پابندی اس وقت سے اب تک تقریباً مسلسل ہی چلی آرہی ہے' سوائے چند بے نتیجہ عارضی وقفوں کے' یا صدر ریگن کے دور میں افغان جہاد کی وجہ سے چند سال کچھ امداد کے۔

صدر جانسن نے یہ پابندی بھی مکمل "غیر جانبداری" کے نام پر لگائی۔ لیکن وہ پاکستان سے صرف اس لیے ناراض نہ تھے کہ اس نے کشمیر میں کیوں مداخلت کی' بلکہ وہ اسے اس بات کی سزا بھی دے رہے تھے کہ اس نے ۱۹۶۲ میں ہندوستان کو دی گئی امریکی امداد کو خاموشی سے کیوں قبول نہیں کیا' چین سے تعلقات کیوں استوار کیے' اور فضائی سروس کیوں شروع کی' ویت نام میں فوجی دستے بھیجنے سے کیوں انکار کیا۔ یہ پابندی بھی جانب دارانہ تھی' کیونکہ بھارت تو صرف ۱۰ فی صد سپلائی امریکا سے لیتا تھا' جب کہ پاکستان کا انحصار "کلیتاً" امریکا پر تھا۔ روس نے تو ۱۹۶۵ کی جنگ ختم ہوتے ہی بھارت کو ترسیل شروع کر دی' لیکن امریکا کی پالیسی میں پاکستان کے لیے کوئی نرم گوشہ نہ پیدا ہوا۔

پھر صدر نکسن نے چین سے تعلقات استوار کرانے میں پاکستان کی مدد کے صلہ میں' ۱۹۶۹ میں' "صرف ایک دفعہ" کی بنیاد پر' نہ کہ "دروازہ کھول دینے" کے لیے' پاکستان کو نقد ادائیگی پر ۳۰۰ مسلح فوجی بردار گاڑیاں (A P C) فراہم کرنے کی منظوری دینے کا عظیم احسان کیا۔ لیکن ۷۱ - ۱۹۷۰ میں مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی اور کانگریس کی شدید مخالفت کی بنیاد پر صدر نکسن بات اس سے آگے نہ بڑھا سکے' بلکہ اپریل ۱۹۷۱ میں پھر مکمل پابندی لگا دی گئی' اور ۳۰۰ گاڑیوں کی فراہمی بھی' جن کی قیمت پاکستان ادا کر چکا تھا' ۱۹۷۵ میں جا کر مکمل ہوئی۔

مسٹر بھٹو نے بھی اسلحہ کا "روزن" کھلوانے کے لیے جان توڑ کوشش کی۔ ان کے واشنگٹن کے دورے کے بعد اپریل ۱۹۷۲ میں پھر "کھڑکی" ذرا سی کھولی گئی' اور کچھ فالتو پرزے فراہم کیے

گئے۔ اس کے لیے مسٹر بھٹو نے امریکا کا بے انتہا شکریہ ادا کیا۔ جب امریکا نے دیکھا کہ پاکستان روس' فرانس اور چین سے اسلحہ خرید رہا ہے' اور ایران اور سعودی عرب نے بھی پاکستان کی سفارش کی' تو صدر نکسن کے جانشین صدر فورڈ نے فروری ۱۹۷۵ میں یہ پابندی اٹھالی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس اقدام سے پاکستان کو کچھ مل سکتا' مارچ ۷۶ میں پاکستان نے فرانس سے نیوکلیر پلانٹ لینے کا معاہدہ کر لیا' اور پاکستان کے نیوکلیر بم کا قضیہ کھڑا ہو گیا۔

اگست ۱۹۷۶ میں کسنجر پاکستان آئے (آخری دفعہ)' اور فرنچ پلانٹ کی خریداری سے باز رہنے کی قیمت کے طور پر ۱۰۰' اے - ۷ جیٹ فائٹر طیارے پاکستان کو فروخت کرنے کا لالچ دیا۔ پاکستانی فوج "غیر یقینی" نیوکلیر پروگرام کے بجائے "نقد" طیاروں کو قبول کرنے کے حق میں تھی' مگر مسٹر بھٹو کو بجا طور پر یہ یقین نہ تھا کہ یہ جہاز مل بھی جائیں گے۔ جلد ہی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اس کے خلاف شور مچانا شروع کر دیا' اس کو رشوت قرار دیا' اور کہا کہ اس سے مستقبل میں بلیک میل کا راستہ کھل جائے گا۔ چنانچہ جب پاکستان نے یہ طیارے خریدنے کی درخواست دی تو صدر کارٹر نے اسے مسترد کر دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ صدر کارٹر نے زور شور کے ساتھ اسلحہ کی فروخت پر پابندی کی ایک عمومی پالیسی بنائی' اس کے باوجود پہلے چار مہینوں میں (مئی تا ستمبر ۱۹۷۷) ۱۸ ممالک کو ۴۱ء۴ بلین ڈالر کے اسلحہ کی فروخت کے ۴۵ معاہدے ہوئے۔ ہاں' اس سارے زور شور کا ہدف ایک ملک بنا' وہ تھا پاکستان۔ یہ حشر ہوا کسنجر کی پیش کش کا۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ اسلحہ کی برآمد پر کنٹرول کے قانون میں صرف پاکستان کو ہدف بنانے کے لیے ترمیم لگائی گئی کہ جو ملک نیوکلیر پلانٹ خریدے اسے کوئی اسلحہ فراہم نہ کیا جائے۔ اس ترمیم کے تحت اپریل ۱۹۷۹ میں پھر پاکستان کو ہر قسم کی فراہمی بند کر دی گئی۔ یہاں تک کہ جو پاکستانی افسر ٹریننگ کے لیے امریکا گئے ہوئے تھے' ان کو بھی واپس کر دیا گیا۔

دسمبر ۱۹۷۹ میں افغانستان پر روس نے حملہ کیا' تو امریکا کے رویہ میں راتوں رات تبدیلی آگئی۔ اب خلیج میں امریکی مفادات کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہ امریکا کے پاس پاکستان کا کوئی متبادل نہ تھا' انھوں نے پاکستان کو دو سال کی مدت میں صرف ۱۰۰ ملین ڈالر سالانہ کی فوجی امداد کی پیش کش کی۔ صدر ریگن نے اس پیش کش کو ذرا معقول صورت دی' پاکستان کے اصرار پر ایف ۱۶ طیاروں کے تین اسکواڈرن فروخت کرنا منظور کیا' قیمت بھی لے لی' لیکن وہ طیارے آج تک امریکا ہی میں کھڑے ہوئے ہیں۔

۱۹۶۲ میں امریکا کی طرف سے ہندوستان کو اسلحہ کی زبردست فراہمی' ۱۹۶۵ میں پاکستان کو فراہمی پر مکمل پابندی' ۱۹۷۱ میں ہندوستان کے حملہ اور بنگلہ دیش کے قیام' اور ۱۹۷۴ میں ہندوستان کے ہیروشیما بم کے مساوی بم کے دھماکہ کے بعد پاکستان نے نیوکلیر بم بنانے کی صلاحیت پیدا کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بم اسرائیل بنا چکا تھا' ہندوستان بنا چکا تھا' ساؤتھ افریقا بنا چکا تھا' لیکن امریکا کا سارا نزلہ پاکستان پر گرا۔ ۱۹۷۶ میں پاکستان نے فرانس سے نیوکلیر پلانٹ خریدنے کا معاہدہ کیا' جس سے وہ بم کے لیے مطلوب یورینیم حاصل کر سکتا تھا۔ امریکا نے اپنے "یار وفادار" پاکستان کو ایک عبرت ناک مثال (horrible example) بنانے کے لیے کارروائیاں شروع کر دیں۔ ۱۹۷۶ میں کسنجر دھمکی دے کر چلے گئے' کارٹر نے اقدامات شروع کر دیے' بیچ میں افغان جہاد کی وجہ سے ایک وقفہ آیا' پھر کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ ایک طرف امریکا پاکستان کو کوئی اسلحہ بیچنے کو بھی تیار نہ تھا' دوسری طرف وہ اسے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کی کوشش کے جرم میں سبق سکھانے پر تل گیا۔ ایک طرف صرف پاکستان کو چھانٹ کر اس کے خلاف کارروائی کی جاتی رہی' دوسری طرف اپنے سارے قوانین کو بالائے طاق رکھ کر' بھارت کے تارا پور پلانٹ کے لیے صدر کارٹر نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے یورینیم فراہم کرنے کی اجازت دے دی۔

کشمیر' پاکستان کی شہ رگ ہے۔ امریکا سے اس کی مکمل وابستگی کا ایک بڑا ہدف یہ بھی تھا کہ کشمیر میں رائے شماری کرانے کے لیے امریکا اپنا وزن ڈالے گا۔ لیکن شہادتوں کے انبار ہیں کہ امریکا نے کشمیر کے مسئلہ کے لیے چند رسمی کارروائیوں اور خوش نما الفاظ کے علاوہ نہ کچھ کیا اور نہ کرنا چاہا۔ یہ ناقابلِ فہم ہے کہ ہمارے حکمراں اس باب میں اس سے جھوٹی توقعات کیوں باندھتے رہے' اور "کلیتا" اس پر انحصار کیوں کیا۔

لیاقت علی خاں تو اتنے سادہ لوح تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ امریکا کشمیر میں ہندوستان کی جارحیت کو کوریا کی جارحیت کے مساوی سمجھے گا' جیسے آج لوگ توقع رکھتے ہیں کہ امریکا بوسنیا میں اسی طرح کارروائی کرے گا جس طرح اس نے خلیج میں کی۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ کوریا اور خلیج میں مغربی مفادات اور تیل بستے تھے' جب کہ کشمیر اور بوسنیا میں صرف مظلوم انسان۔

پاکستانی حکمراں جانتے تھے کہ امریکا کے ساتھ دفاعی معاہدوں میں شرکت سے وہ روس' چین اور غیر جانبدار تحریک کے دیگر ممالک کی حمایت کھو دیں گے۔ لیکن وہ یہ مخالفت مول لینے کی بھاری قیمت ادا کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے' اس لیے کہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ کشمیر پر

امریکا کی حمایت ان سب کی مخالفت پر بھاری ہو گی۔ ہندوستان کو بھی ان معاہدوں کا بہانہ ہاتھ آگیا' اور اس نے رائے شماری سے انکار کر دیا۔ مسلم ممالک کی حمایت بھی پاکستان نے کھو دی۔ ناصر نے پاکستان کو "مغربی سامراج کا پٹھو" قرار دیا' اور اعلان کیا کہ "سویز ہمیں اتنا ہی عزیز ہے جتنا ہندوستان کو کشمیر"۔ (طاہر خیلی' ص ۱۳)

جب روس اقوامِ متحدہ میں رائے شماری کے حق میں اپنے موقف سے پھر گیا' تو امریکا نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا۔ پاکستان نے بھی اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ امریکا کی حمایت کو کافی سمجھتا تھا۔ بالآخر دسمبر ۱۹۵۵ میں خرو شچیف اور بلگانن نے سری نگر میں یہ اعلان کیا کہ :"کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے"۔ اس پر بھی امریکا ٹس سے مس نہ ہوا۔ ۱۹۶۲ میں ہندوستان اور چین کی لڑائی شروع ہوئی' تو امریکا نے سب سے بڑھ کر اس بات کی کوشش کی کہ اس مرحلہ پر پاکستان ہندوستان کے لیے کوئی مشکل نہ پیدا کرے' بلکہ کشمیر کے بارہ میں منہ سے بھاپ بھی نہ نکالے۔ صدر کینیڈی نے اس مقصد کے لیے ایوب خاں کو خط لکھے اور اپنے خصوصی ایلچی بھیجے۔

معاہدہ تاشقند کے بعد کشمیر کا مسئلہ سب کے ایجنڈے سے محو ہو گیا' یہاں تک کہ کشمیری مجاہدین نے اپنے خون سے اس کو دوبارہ رقم کرنا شروع کیا۔ اس مرحلہ پر جب ہندوستان کشمیر میں بدترین مظالم ڈھا رہا ہے امریکا یا تو پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے' یا ایسے حل تلاش کرنے میں مصروف ہے جن سے ہندوستان ناراض نہ ہو' جہاد بھی ٹھنڈا پڑ جائے اور امریکا کے مفادات پورے ہونے کا بھی کوئی راستہ نکل آئے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے اشارات' ترجمان القرآن' جون ۱۹۹۴)

پاکستانی حکمرانوں نے شروع ہی سے یہ طے کر کے امریکا سے تعلقات قائم کیے تھے کہ انھیں صرف امریکا ہی کا بن کر رہنا ہے۔ کسی اور کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھنا۔ بیچ میں روٹھنے' اور خود ہی من جانے کے کچھ مراحل آئے' لیکن حکمراں "وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے" کی راہ پر گام زن رہے۔ اور ہمارے خیال میں اب بھی ہیں۔

صدر ٹرومین نے ۱۹۴۹ میں پنڈت نہرو کو امریکا کے دورے کی دعوت دی' اور پاکستان کی طرف سے خواہش کے باوجود لیاقت علی خاں کو نظرانداز کر دیا۔ جب انھوں نے روس کی طرف سے ماسکو کے دورہ کی دعوت قبول کر لی' تو صدر ٹرومین نے ۲۳ نومبر ۱۹۴۹ کو انھیں دورۂ امریکا کی دعوت دے دی' لیاقت علی خاں نے جھٹ سے ماسکو کا دورہ منسوخ کر دیا۔ یہ دورہ ایسا منسوخ ہوا

کہ پھر اس کے ۱۶ سال بعد صدر ایوب پہلے پاکستانی سربراہ تھے جو اپریل ۱۹۶۵ میں ماسکو گئے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں' جب کہ روس ایک عالمی طاقت تھا اور پاکستان کا پڑوسی بھی۔

امریکا سے تعلقات کی خاطر پاکستان نے مسلم ممالک کو بھی نظر انداز کر دیا' یہاں تک کہ سویز کے مسئلہ پر بھی وہ مغرب کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ وزیر اعظم سہروردی نے دسمبر ۱۹۵۶ کو نیشنل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "امریکا اور برطانیہ جیسی بڑی طاقتوں کے ساتھ بندھنے کے بجائے ہم مسلمان ملکوں کے ساتھ متحد کیوں نہیں ہوتے؟ میرا جواب ہے کہ صفر + صفر + صفر' بہرحال صفر ہی رہے گا" (دستاویزات' ص ۱۲۵)۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۷ کو انھوں نے کہا: "یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہماری پشت پر ایک طاقت ور ملک ہے جو ہماری سالمیت اور سیاسی آزادی کی ضمانت دے رہا ہے" (دستاویزات' ص ۱۳۴)۔ پھر ۲۵ فروری کو انھوں نے مزید کہا: "وہ یہ یاد رکھیں کہ ہم دل وجان سے ان کے ساتھ ہیں ... اگرچہ ہم چھوٹے ہیں ... ان کو ہم سے زیادہ بڑا وفادار دوست نہیں ملے گا" (دستاویزات' ص ۱۲۸)۔ صدر ایوب خاں نے جولائی ۱۹۶۰ کو فارن افیرز میں لکھا: "پاکستان نے کھلم کھلا اور غیر مشروط طور پر اپنی قسمت مغرب کے ساتھ وابستہ کر دی ہے" (دستاویزات' ص ۱۸۷)۔ ۱۷ جولائی ۱۹۶۱ کو انھوں نے کہا: "جب مشکل وقت پڑے گا' تو ایشیا میں پاکستان امریکا کا واحد دوست ہو گا" (دستاویزات' ص ۲۰۳)۔ امریکا نے جب آنکھیں پھیرنا شروع کیں' تو مسٹر بھٹو نے ۲۴ جولائی ۱۹۶۳ کو نیشنل اسمبلی میں گلہ کیا: "ہم نے مغرب کے لیے قربانیاں دیں ہیں۔ مسٹر کروشچیف نے ہمیں دھمکی دی کہ پاکستان کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ ہم نے اپنا پورا مستقبل مغرب کے ساتھ اتحاد کے داؤں پر لگا دیا۔ دونوں کے درمیان جنگ کی صورت میں ہم نے نیوکلیر جنگ کا خطرہ مول لیا۔ لیکن آج کیا ہو رہا ہے!" (دستاویزات' ص ۲۲۳)۔

پاکستان نے' جو امریکا کا یارِ وفادار رہا ہے اور اب بھی ہے' اگر امریکا کے علاوہ کسی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھا تو امریکا نے اس کی تذلیل و تحقیر بھی کی' اور سزا بھی دی۔ جب ۱۹۶۲ میں امریکا نے بھارت کو زبردست مقدار میں اسلحہ دیا' تو صدر ایوب نے جوابی کارروائی کے طور پر مارچ ۱۹۶۳ میں چین کے ساتھ سرحدی معاہدہ کر لیا' پھر پیکنگ تک فضائی سروس شروع کر دی' اور ۱۹۶۴ میں صدر جانسن کی طرف سے ویت نام میں فوجی دستے بھیجنے سے انکار کر دیا۔ صدر جانسن نے اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لیے اپریل ۱۹۶۵ میں ایوب کا مجوزہ دورہ امریکا منسوخ کر دیا' اور ۱۹۶۵ میں ہونے والی پاکستان کے امدادی کنسورشیم کی میٹنگ بھی منسوخ کرا دی۔ گویا امریکا ایک عالمی طاقت ہونے کی حیثیت سے آزاد تھا کہ جس سے چاہے "تعلق" قائم کرے اور پاکستان سے جیسا چاہے سلوک کرے' پاکستان کو ایک

چھوٹے' محتاج اور باج گزار ملک ہونے کی وجہ سے یہ اجازت نہ دی جا سکتی تھی کہ وہ ہرجائی پن کا مظاہرہ کرے۔

امریکا سے ہم کوئی گلہ شکوہ کرنا صحیح نہیں سمجھتے۔ اس نے ہمیں کبھی دھوکے میں نہیں رکھا۔ اس کی پالیسی آغاز ہی سے یکساں اور واضح رہی ہے۔ ہم ہی نے جھوٹی توقعات باندھیں' اور خود فریبی میں مبتلا رہے۔ اس کی پالیسی بین الاقوامی سیاست کے اس معروف اصول کے عین مطابق رہی ہے کہ : "کوئی دوست' مستقل دوست نہیں ہوتا' اصل دوستی صرف اپنے مفادات سے ہوتی ہے"۔ ہمارا گلہ شکوہ ہے تو اپنے حکمرانوں سے ہے۔ انھوں نے اپنے مفادات کو فراموش کر دیا' امریکا سے مستقل دوستی گانٹھی۔ اس کی پشت پناہی کو کافی سمجھا۔ اور' پے در پے بین الاقوامی سیاست کی تلخ حقیقتوں سے دوچار ہونے کے باوجود' انھی پتّوں پر آج بھی تکیہ کیے ہوئے ہیں۔

آج درونِ پردہ کیا ہو رہا ہے ؟ اس سے ہم زیادہ باخبر نہیں۔ لیکن محسوس یہی ہوتا ہے کہ ماضی کے سارے اسباق' سیاستِ عالم میں دوررس تبدیلیوں' اور دنیا میں برپا تہذیبی کشمکش کے باوجود' یہ تعلقات ماضی کی نہج سے کچھ زیادہ مختلف انداز میں پروان نہیں چڑھ رہے۔ امریکہ کی طرف سے وہی بھارت نوازی اور پاکستان پر چاند ماری (Pakistan - bashing) ہے' ایٹمی پروگرام سے دست برداری اور منڈیاں کھول دینے پر اصرار ہے' کہ اب کمیونزم کے زوال کے بعد' ایک طرف اڈوں' میدانِ جنگ اور کرایہ کے سپاہیوں کی ضرورت ختم ہو گئی ہے' اور دوسری طرف چاند ماری میں شدت سے کسی نقصان کا خدشہ بھی نہیں ہے۔ پاکستان کی طرف سے وہی ڈالروں اور اسلحہ کے لیے گدائی' اور اس کی عوض امریکی مطالبات کی تکمیل۔

امریکا کے ساتھ خوش گوار تعلقات ہماری قومی و سیاسی ضرورت بھی ہیں' اور نظریاتی بھی۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ان تعلقات کی نئے خطوط پر تشکیلِ نو کی شدید ضرورت ہے۔

۱۔ اس تشکیلِ نو کے لیے سب سے پہلے سیاستِ عالم کا صحیح ادراک ضروری ہے۔ ہمارا ترپ کا پتّا امریکا کا کمیونزم کی توسیع کا خوف تھا۔ اب یہ پتّا ہمارے ہاتھ میں نہیں رہا۔ بھارت کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کی روک تھام کرنا' یا اس کے ساتھ ہمارے عدم توازن کو کم کرنا' امریکہ کے ایجنڈے میں کوئی مقام نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا مفاد یہ ہے کہ بھارت کی طاقت بڑھتی رہے' ہم اپنی حدود میں رہیں' ایٹمی صلاحیت حاصل کریں نہ جارحانہ اسلحہ' اور اس کی بالادستی تسلیم کرلیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ہمارے پاس کوئی کارڈ نہیں رہ گئے۔

۲- اسی طرح مستقبل کی تہذیبی کشمکش کے امکانات اور نہج کا صحیح ادراک بھی ضروری ہے: مغرب کے اندازے اور منصوبے' اور ہمارے اپنے اہداف اور کرنے کے کام کیا ہیں۔ اس لیے کہ مغرب نے "اسلامی خطرہ" کا جو تصور بنا لیا ہے' اس کے ہمارے تعلقات پر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں' اور یہ مزید گہرے ہوتے جائیں گے۔ لیکن اسلام کو "خطرہ" کے بجائے ایک "امکان" بنانا ممکن ہے۔

۳- یہ جاننا چاہیے کہ ان تعلقات کو خوش گوار رکھنے کے لیے یہ ضروری نہ ہونا چاہیے کہ ہم امریکا کے دست نگر بھی ہوں یا اس کے ہر مطالبہ کے آگے سر جھکاتے چلے جائیں۔ اپنے اہداف کے واضح شعور کے ساتھ' ثقافتی و معاشی محتاجی و گدائی سے نجات پا کر' ہمارے لیے یہ ممکن ہونا چاہیے کہ اپنے اہم اور حساس قومی مفادات اور اپنی دینی و نظریاتی حیثیت قربان کیے بغیر بھی' لین دین کے اصول پر خوش گوار تعلقات رکھ سکیں۔

۴- امریکا ایک بہت بڑا اور طاقت ور ملک ہے' غالب مغربی تہذیب کا لیڈر ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا ملک بہت چھوٹا ہے' اور ہم نے اپنی غلط کاریوں سے اسے اور بہت "چھوٹا" کر دیا ہے۔ ۱۹۸۷ کے ایک امریکی تجزیہ کے مطابق: "ایک انتہائی ضعیف حلیف' مفلس اور قلاش' جس کی تاریخ سیاسی افتراق و عدم استحکام کی تاریخ ہے" (ورسنگ' ص ۱۱-۱۲)۔ ہمارے ہاتھ میں کارڈ پہلے بھی زیادہ نہ تھے' اب اور تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ شعور ہونا چاہیے کہ یہ لین دین برابر کا ہونا دشوار ہے۔ لیکن تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ایک کمزور فریق' اگر حکمت اور واضح حکمتِ عملی رکھتا ہو' تو کچھ زیادہ دے کر بھی آگے بڑھنے کا راستہ بنا لیتا ہے' بشرطیکہ ہمارے ماضی و حال کے حکمرانوں کی طرح پہلے ہی دل و جان سے غلام بننے کو تیار نہ ہو۔ صلاح الدین ایوبی نے لین دین میں جس نشیب و فراز سے گزر کر بیت المقدس دوبارہ فتح کیا' اس سے واقفیت ہی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

۵- قومی سطح پر جذباتی انداز میں امریکا پر چاند ماری (America - bashing) کو بھی ختم ہونا چاہیے۔ قرآن نے بتوں کو بھی برا بھلا کہنے سے منع کیا ہے۔ امریکا سے اختلاف ہو سکتا ہے' اس پر سنجیدہ اور مدلل تنقید ہونا چاہیے' اس کی دو عملی سیاست کی نقاب کشائی بھی' لیکن دشنام طرازی اور غیر منصفانہ تنقید ہمارے دین و ایمان کے بھی منافی ہے' ہمارے قومی مفاد کے بھی' اس سے کچھ حاصل بھی نہیں۔

۶- ہمیں امریکی سیاسی نظام میں طاقت کے ہر مرکز سے اپنے اہداف کے حصول کے لیے رجوع کرنا چاہیے۔ ابتدائی دور کی دوستی کے "سنہرے لمحات" ایوب خاں جیسے لوگوں کے آئزن

ہاور، جان فاسٹر ڈلس اور ایڈمیرل ریڈ فورڈ جیسے لوگوں سے ذاتی تعلقات پر قائم تھے۔ جب ڈلس کا انتقال ہو گیا اور آئزن ہاور کی جگہ کینیڈی صدر ہو گئے، تو ان کے تعلقات کے نیچے سے زمین سرکنا شروع ہو گئی۔ پاکستانی حکمرانوں نے امریکی حکومت کی دوسری شاخ، کانگریس اور سینیٹ، سے تعلقات کو کوئی اہمیت نہ دی، اور امریکا میں پاکستان کی کوئی لابی سرگرم کار نہ رہی۔ اب ہمیں وہاں اپنی مضبوط لابی بنانا چاہیے۔ پروفیشنل لابی بھی، اور پاکستانی امریکن شہریوں کی لابی بھی۔

۷ - باہمی تنازعات موجود ہیں، اور رہیں گے۔ لیکن ہمیں امریکی حکمرانوں اور پالیسی سازوں، جن سے ہم معاملات کرتے ہیں، اور عام امریکی افسران اور عوام کے درمیان فرق ملحوظ رکھنا چاہیے، اور انصاف اور حق کے حوالہ سے براہِ راست ان کے دل و دماغ سے اپیل کرنا چاہیے۔ امریکا ہی میں یہ ممکن ہے کہ بوسنیا کے مسئلہ پر اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے تین اعلیٰ افسران استعفےٰ دے دیں، اور امریکن عوام امریکا کو ویت نام اور صومالیہ سے نکلنے پر مجبور کر دیں۔

۸ - ہمیں امریکا کی تاریخ، ان کی جڑوں (roots) اور نفسیات سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔ یہ ملک "اللہ سے عہد" (Covenant of God) کے ایفا اور حکومتِ الٰہیہ (Kingdom of God) کے قیام کی جستجو میں قائم ہوا تھا۔ اگرچہ اب مشہور سوشیالوجسٹ رابرٹ بیلا (Bellah) کے الفاظ میں، نقضِ عہد کے نتیجہ میں یہ میثاق "میثاقِ شکستہ" (broken covenant) بن چکا ہے۔ اور امریکا میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس "میثاق" کے ورثہ میں ہمیں ایسی بے شمار چیزیں مل جائیں گی جو کَلِمَةٍ سَوَاءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ کا مصداق ہوں۔ اپنی کمزوری اور عدم توازن کے باوجود ہم یہ مشترک اقدار و مفادات تلاش کر سکتے ہیں، اور خوش گوار تعلقات میں یہ اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں۔

ہم ڈپلومیٹک عمل میں نئے متعین اقدامات کی نشان دہی نہیں کرنا چاہتے کہ یہ، اس عمل سے پوری آگاہی کے بغیر، اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہو گا۔

تقریباً نصف صدی کی غلط پالیسیوں، بد عملیوں اور امریکا کے ساتھ اندھا دھند وابستگی اور مکمل انحصار کے نتیجہ میں جو تنکے بکھر چکے ہیں، ان کو جوڑ کر ہم اپنا آشیاں پھر سے تعمیر کر سکتے ہیں۔ ضعف و شباب قوموں کا اٹل مقدر نہیں۔ صحیح سمت و مقصد اختیار کر کے اور صبر و حکمت کے ساتھ مناسب اقدامات کر کے ہم اپنی پس ماندگی اور ذلت اور محتاجی کی موجودہ حالت میں عظیم تغیر برپا کر سکتے ہیں۔

۱- صحیح سمت و مقصد سب سے مقدم ہے۔ ہم دفاع اور سلامتی کے لیے' بقا و ترقی کے لیے' صرف اللہ کی طرف دیکھنے کا فیصلہ کرلیں' امریکا کی طرف نہ کسی اور کی طرف۔ **وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ** (جو اپنے کو اللہ کے سپرد کر دے' اللہ اس کے لیے کافی ہے)۔ **اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ** (وہ' جن سے لوگوں نے کہا کہ تمھارے خلاف بڑے لوگ جمع ہو گئے ہیں' ان سے ڈرو' تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے)۔

دجالی تہذیب کے غلبہ کے اس دور میں' جب اسباب ہی ارباب بن گئے ہیں' یہ بات "ملا کی بڑ" لگے گی۔ جب کارڈینل ولزے (م ۱۵۳۰) کو' جس نے برطانیہ کے ہنری ہشتم کی وفاداری اور یکے بعد دیگرے اس کی شادیوں کے لیے اجتہاد و تحریف کے لیے اپنی جان لڑا دی' بالآخر بادشاہ نے موت کی کوٹھری میں پہنچا دیا' تو اس نے کہا کہ "اگر میں نے اتنی ہی جانثاری سے اپنے خدا کی خدمت کی ہوتی' تو وہ مجھے اس انجام تک نہ پہنچاتا"۔ جس یکسوئی اور اخلاص سے ہم نے امریکا کی طرف دیکھا' اگر خدا کی طرف دیکھتے اور اس کا دامن پکڑتے تو اس انجام تک نہ پہنچتے۔

۲- دوسرا قدم یہ ہے کہ ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ ہماری ترقی اور دفاع کا انحصار صرف اسلحہ پر نہیں ہے جو امریکا ہمیں دے' نہ معاشی ترقی پر جو سودی قرضے لے کر ہو۔ اس مقصد کے لیے عصائے موسوی ہماری بغل میں ہے' ہم ہی رسی کے سانپوں کو دیکھ دیکھ کر کانپ رہے ہیں یا ان کے آگے سجدہ ریز ہو رہے ہیں۔ "اگر اللہ تمھاری مدد کرے گا' تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا" (**اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ**) ۔ "اللہ تمھاری مدد اس وقت کرے گا جب تم اللہ کی مدد کرو گے" (**اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ**)۔ "اگر تم صبر اور اختیار کر لو تو [تمھارے دشمنوں] کا کوئی حربہ تمھیں نقصان نہ پہنچا سکے گا" (**اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا**)۔

۳- اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہو یا شریعت نافذ کرنا ہو' لائحہ عمل میں سب سے پہلا اقدام یہ ہے کہ ہم مغربی ثقافت کی غلامی سے نجات حاصل کریں۔ زبان میں' لباس میں' رسوم و رواج میں' میڈیا میں۔ ثقافت کا بسیرا زبان کے قالب میں ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ' ہم مناسب سطح پر بہترین انگریزی ضرور پڑھائیں' لیکن ہر طالب علم کو نہ پڑھائیں اور دفاتر' عدالتوں' فوج اور بازاروں کو انگریزی سے پاک کردیں۔

۴- دوسرا اہم عملی اقدام یہ ہے کہ ہم معاشی خود کفالت کی فکر کریں۔ جلد از جلد

بتدریج سودی قرضوں سے نجات حاصل کریں' اسراف و تبذیر ختم کر دیں' ترقی کے اجتہادی "ماڈل" اختیار کریں' "پیداوار سے زیادہ "انسان" کو ترقی دیں' اور جو اللہ نے ہمیں دیا ہے اسی کے اندر اپنے منصوبے بنائیں۔

۵ - دفاع کے لیے ہم' اپنے خطرات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر' جرات کے ساتھ وہ فیصلے کریں جن سے ہماری سلامتی کا تحفظ واقعی ممکن ہو سکے۔ ہمیں آگے بڑھ کر دشمن کو روکنے کی تیاری بھی کرنا چاہیے' سرحدوں کے دفاع کی بھی' لیکن دراصل ساری قوم کو ایسی عوامی مزاحمت کے لیے تیار کرنا ضروری ہے کہ کوئی دشمن اندر گھس جائے تو اس کے لیے جینا دوبھر ہو جائے۔

۶ - یہ سارا لائحہ عمل اسی طرح ایک خواب رہے گا جس طرح اب تک رہا ہے' جب تک ہمیں اس پر یقین رکھنے والی اور اس کو خلوص و محنت سے عملی جامہ پہنانے والی سیاسی قیادت میسر نہ آئے۔ صرف حکومت کی سطح پر نہیں بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں۔

کیا ہماری موجودہ قیادت --- حکومتی ہو یا معاشرتی --- یہ کام کر سکتی ہے ؟ ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں' کہ نہیں!

۱۔ دستاویزات سے مراد ہے : *K.Arif (ed)*, America - Pakistan Relations, *Documents Vol 1, Lahore, 1984.*

۲۔ فارن ریلیشنز : *United States, Department of State,* Foreign Relations of the United States, *Washington, 1972.*

۳۔ ورسنگ : *Robert G.Wirsing,* Pakistan Security Under Zia, 1977 - 1988, *London, 1991.*

۴۔ طاہر خیلی : *Shirin Tahir - Kheli,* United States and Pakistan, *New York, 1982.*